© rasailojaraid.com

قائدِ شریعت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق قدس سرہٗ

پیکرِ حلم و تواضع

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے یہ تلمیذِ رشید اپنے استاذ کی طرح کسی کو بھی اپنے سے حقیر و کمتر سمجھنے کے روادار نہ تھے یہی وجہ تھی کہ نہ صرف تنقید سُننے کا حوصلہ تھا بلکہ بڑی ہمت کے ساتھ اس کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ کیا حقیقی تواضع کے بغیر عملاً اس رویے کو اپنانا آسان ہے؟

حضرت مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

عام طور پر مکیاوُلی کی کتاب THE PRINCE کو ناپسند کیا جاتا ہے کہ اُس نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے جھوٹ اور دھوکے و فریب کی راہ دکھلائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غریب مصنّف کا اضافی قصور اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس نے مزعومہ طرقِ کامیابی کے اظہار میں اضمار سے بالکل کام نہیں لیا ہے بلکہ کسی لگی لپٹی کے بغیر وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اگرچہ بدنامِ زمانہ تو ہیں لیکن از روئے دلالت صاف و صریح اور براہِ راست انہیں طرق کے لیے موضوع و مقرّر ہیں، نہیں تو مطالب و معانی کے اعتبار سے مکیاوُلی اور دُوسرے معلّمین میں کوئی فرق نہیں، سب کے سب اوروں کی ہلاکت و بربادی پر اپنی تعمیر و ترقی کی بنیاد رکھنے کی پٹی پڑھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

مکیاوُلی طرزِ تعلیم

آج سے دس پندرہ سال پہلے مشہور امریکی ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ یہ کتاب بالخصوص اسی موضوع پر لکھی گئی تھی کہ زندگی میں کامیابی کا راز کیا ہے؟ لیکن ایک سرسری مطالعے ہی سے معلوم ہُوا کہ اُخروی کامیابی کا تو ذکر ہی کیا، اس پر عمل کرنے سے تو دُنیاوی کامیابی بھی سخت خطرے میں پڑ جائے گی ــــ کتاب کی اصل رُوح یہ تھی کہ اپنے مقصود و مطلوب کو عبارت آرائیوں اور نفسیاتی حیلہ گریوں سے مخاطب کا مقصود و مطلوب ثابت کیا جائے اور پھر اس کی تحصیل میں اسی کو استعمال کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ دو چار دفعہ کا سابقہ پیش آجانے کے بعد مخاطب اس اندازِ گفتگو میں چھپی ہوئی خود غرضی کو بھانپ لے گا جس سے اس کو مزید احمق بنانے کی راہیں مسدود ہو جائیں گی جبکہ یہی تحمیق ہی تو کامیابی حاصل کرنے کا محور و مدار ٹھہری تھی۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں جامعیت

امر واقعہ یہ ہے کہ انسان کتنا ہی ذہین و فطین اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل کیوں نہ ہو زندگی کے واقعات و تجربات سے استخراجِ نتائج میں غلطی و خطا سے مبرّا نہیں۔ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں بے شمار حکماء و عقلاء گذرے ہیں جن میں سے ہر ایک نے کامیابی حاصل کرنے کے گُر بتلانے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے کسی کے اقوال و افکار میں وہ جامعیت اور ہمہ جہتی افادیت موجود نہیں ہے جو انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والتسلیمات اور ان کے فیض یافتگان کے حکیمانہ فرمودات و ارشادات میں پائی جاتی ہے۔

روحانی اور جسمانی کامیابی کا باہمی رابطہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصولِ کامیابی کی طرف راہنمائی میں ان دو گروہوں کے درمیان رسائی و نارسائی کا یہ عظیم فرق کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لیے کسی قدر توطئے و تمہید کی ضرورت ہے۔

ارواحِ انسانی اگرچہ قدیم اور ازلی تو نہیں لیکن لافانی اور ابدی ضرور ہیں، ان کی دُنیاوی اور اُخروی زندگیاں مل کر اس ابدیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ابدی مخلوق کے حق میں وہی کامیابی کامل و مکمل کہلائی جاسکتی ہے جو اس کی ابدی زندگی کو شامل ہو فقط دنیاوی یا اُخروی کامیابی کو پوری کامیابی ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیز یہ حقیقت بھی حد درجہ لائقِ اعتناء ہے کہ اگرچہ انسان جسم اور رُوح کا مرکب ہے لیکن کامیابی و ناکامی کے سلسلے میں روح اصل اور جسم اس کا تابع ہے۔ روح کی کامیابی کے بغیر جسم کی کامیابی کا احتمال عقلی اور امکان منطقی ہو تو ہو لیکن واقعات کی دُنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ روحانی کامیابی کے بغیر جسمانی کامیابی کی مثال اُس مسافر کی سی ہے جو کسی ریل گاڑی کے فسٹ کلاس یا ائیرکنڈیشنڈ بوگی میں نرم و نازک صوفے کی کُھلی نشست پر پیر پھیلائے دراز ہو لیکن ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے چیکر کے خوف سے اس کا لمحہ لمحہ بے کلی میں کٹ رہا ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیاں اس کی اندرونی بدحالی کی غمازی کر رہی ہوں۔ اسی صورتِ حال کی ایک دوسرے انداز سے بہت عمدہ توضیح اس حدیثِ قدسی سے بھی ہوتی ہے:۔

ابن آدم تفرغ لعبادتی املاء صدرك غنیً واسد فقرك وان لا تفعل ملأت یدك شغلاً ولم اسد فقرك۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

(ترجمہ) "آدم زادے! اپنے آپ کو میری عبادت کے لیے فارغ کر، میں تیرے سینے کو بے پرواہی سے بھر دوں گا اور تیری حاجات کو پورا کر دوں گا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تیرے ہاتھوں کو تو مصروفِ کار کر دوں گا لیکن تیری ضروریات کو پورا نہیں کروں گا۔"

عقل کا دائرہ ادراک اور نورِ وحی کی ضرورت

اب مذکورہ بالا سوال کا جواب آسان ہو گیا اور وہ اس طرح سے کہ نورِ وحی سے محروم حکماء و عقلاء تو فقط عقل سے طرقِ کامیابی کی تعیین کی کوشش کرتے ہیں جبکہ بیچاری عقل تو انسان کی کلی دُنیاوی زندگی کا احاطہ بھی نہیں کر سکتی چہ جائیکہ فوز و فلاح کے اصول و ضوابط وضع کرنے میں اُخروی زندگی کی ان لامحدود وسعتوں کی رعایت کر سکے جو نہ صرف نامانوس و نادیدہ ہیں بلکہ ناقابلِ تصور بھی ہیں بخلاف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے کہ ان کی ہدایات و تعلیمات میں بیک وقت دُنیا و آخرت کے حِکَم و مصالح مرعی و ملحوظ ہوتے ہیں کیونکہ نورِ نبوت سے ان کا دائرۂ ادراک پھیل کر ابدی زندگی اور اس کی تفصیلات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ عقل فقط دنیاوی زندگی کے تجزیئے میں بھی ناکام کیوں ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان کی دنیاوی زندگی بمقابلۂ آخرت بہت تنگ و محدود ہونے کے باوجود فی نفسہ بہت زیادہ متنوع و متشعب ہے۔ عقل کے لیے ہر نوع و شعب کے جملہ مسائل اور ان سب کا صحیح صحیح حل معلوم کرنا آسان نہیں، علاوہ ازیں مجاورتِ جسم کی بدولت وہ عام طور پر جسمانی تقاضوں سے مغلوب و متاثر ہوتی ہے۔ نتیجتہً ابدی زندگی کی پوری پوری کامیابی کی تدابیر تلاش کرنے میں اس کے فیصلے ادھورے اور ناتمام ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے فرمودات میں گہرائی اور گیرائی کے حسنِ معنوی کے ساتھ ساتھ حسنِ صوری کی بھی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ وصف بھی ہر پیغمبر کے کلام میں پایا جاتا ہے، لیکن جوامع الکلم کا اعزاز پانے والے نبیٔ آخر الزمان کے ارشادات تو اس کا شاہکار ہیں۔ آپؐ کی احادیثِ مبارکہ میں اضداد و متقابلات کا بہت ہی خوشگوار اجتماع ہوتا ہے۔ یہ تقابل و تضاد نہ صرف الفاظ کے مفاہیم شخصیہ میں بلکہ ان کی صفاتِ کلیہ میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ مثلاً احادیث میں سلاست و روانی بھی ہوتی ہے اور ایجاز و اختصار بھی، کلمات کا ابتذال بھی ہوتا ہے اور عظمت و شکوہ بھی، حالانکہ عام طور پر سلاست کے ساتھ طوالت اور ایجاز و اختصار کے ساتھ تعقید و اغلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عموماً ابتذال کسی قدر سُبکی و خستگی اور عظمت و شکوہ غرابت سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔

احادیث کے لفظی اور معنوی محاسن

مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں حدیث عنوان کا جائزہ لیجیے تو محسوس ہوگا کہ حدیث کیا لفظی و معنوی محاسن کا مرقع ہے تواضع و رفعت یعنی پستی و بلندی کی ضدیت اور دونوں لفظوں کے متخالف عادی صفاتِ کلیہ کے اجتماع نے صاحبِ کلام کے افصح العرب ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کیا ہے۔ تواضع و رفعت اور حدیث کی بقیہ ساخت و ترکیب کو فصاحت و بلاغت کی لفظی کسوٹی سے پرکھیے، حسنِ الفاظ اور حسنِ کلام کی وہ کون سی خوبی و کمال ہے جس کی یہاں ادنیٰ سے ادنیٰ کسر رہ گئی ہو ۔۔۔ یہ تو حدیث کی جودتِ لفظی کا حال ہے، رہی اس کی جودت و جزالتِ معنوی کہ جو بظاہر بہت مُستبعد و محال نظر آتی ہے کہ پستی تو پستی ہی کو جنم دے گی اس سے رفعت کیونکر پیدا ہوگی اور جس پر پیغمبر کی صداقت اور مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى کا کلامِ الٰہی ہونا بھی موقوف ہے۔ سو پوری تاریخِ انسانی اس کی گواہ ہے اور شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحب قدس سرہ العزیز کی زندگی اور موت اس کی تازہ ترین مثال و مؤید ہے۔

مولانا عبد الحقؒ کی حیات اور علمِ حدیث کی برکات

حضرت مولانا صاحب مرحوم کو ربّ تعالیٰ نے بہت زیادہ پُرشکوہ زندگی و موت نصیب فرمائی۔ راقم الحروف کی معلومات کی حد تک حضرت مولانا صاحب مرحوم کے خاندانی حالات اور آغازِ حیات میں مادّی نقطۂ نظر سے ایسا کوئی رمز و اشارہ نہیں پایا جاتا جس سے ایسے قابلِ رشک مستقبل کا پتہ لگایا جا سکے۔ ایک غریب خاندان میں جنم لینے والا بالکل ہی سیدھے سادے مگر صالح اور علم دوست والدین کا عام الاستعداد بیٹا قریبی گرد و پیش میں تحصیلِ علم کے کئی مراحل طے کر کے تحصیلِ مزید کیلئے بالآخر علم و عرفان کے مرکز دار العلوم دیوبند پہنچ جاتا ہے اور کئی برس کے تعلیم و تعلّم کے بعد علم اور نورِ علم کی دولت سے مالا مال ہو کر اپنے مرزبوم اکوڑہ خٹک لوٹتا ہے تو اپنے محلّے کی مسجد میں بیٹھ کر وقت کے مروجہ عمومی انداز میں طلبۂ علومِ دینیہ کو پڑھانے لگتا ہے معلوم نہیں کتنوں نے اُس سے علم کے ساتھ ساتھ نورِ علم بھی حاصل کیا ہوگا لیکن خود تو علم سے بڑھ کر نورِ علم کے حوالے سے بہت زیادہ مشہور و معروف ہو گئے۔ اس نورِ علم میں بلاشبہ بہت سی دوسری صفاتِ علمیہ کو بھی دخل ہوگا لیکن صفت تواضع و انکسار اس قدر عیاں و نمایاں تھی کہ ہر ملنے والے کو پہلے ہی واہلے میں اس کا بہت شدت سے احساس ہو جاتا۔ مجھے اس فیصلے میں کسی ریب و تردد کا شائبہ تک نہیں گذرتا کہ مولانا مرحومؒ کی عظمت و رفعت اسی عجز و انکسار کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچہ بھی، نہیں تو عقل و علم میں ان کے کئی دوسرے ہمعصروں کو اُن کے ہم پایہ کہ فائق بھی مانا جا سکتا ہے لیکن قدر و منزلت کا جو عالی مقام مولانا مرحومؒ کے حصے میں آیا وہ تو کیا اس کا ایک معتد بہ حصہ بھی کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ غالباً تواضع ہی تھی جو ان کو سید الطائفہ اور سرخیلِ علماء کا مقام رفیع بخشتا، اب بھی من تواضع للہ رفعہ اللہ کی صداقت میں کوئی گنجلک باقی ہے۔

آج کی دنیا میں مادیات کا غلغلہ ہے اور اسی کی چمک دمک نے نگاہوں کو خیرہ اور چکاچوند کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان مادی اشیاء کی تحقیق میں بہت آگے نکل گیا ہے۔ اعیان تو کیا مادی اعراض کی کمیت و کیفیت معلوم کرنے کے لیے بڑے حسّاس قسم کے آلات تیار کیے گئے ہیں، لیکن اقدار اور روحانی فضائل و رزائل سے اس کو کوئی سروکار نہیں، کیا عجب اگر ان پر بھی توجہ اسی قدر مرتکز کی جاتی تو اس کی پیمائش کے خاطر خواہ طریقے دریافت ہوتے لیکن چونکہ ایسا نہیں ہو سکا ہے اس لیے ہم مولانا مرحومؒ کی تواضع کی بھی ٹھیک ٹھیک مقدار تو معلوم نہیں کر سکتے لیکن دورانِ طالبعلمی احقر نے دارالعلوم حقانیہ میں مولانا مرحوم کے بہت سے ایسے واقعات دیکھے جس سے محسوس ہوتا تھا کہ اُن کا جامِ تواضع اس قدر لبالب ہے کہ عنقریب چھلک پڑنے کو ہے۔

انکسار و تحمل اور شیخ مدنیؒ کا پرتو

کسی زمانے میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ دارالعلوم حقانیہ کے مدرّس تھے وہ نہ صرف جماعت اسلامی سے وابستہ بلکہ مولانا مودودی مرحوم کے علمی مشیر یا وکیل کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کئی اختلافی مسائل کی وجہ سے علماء کا ایک بڑا طبقہ مولانا مودودی مرحوم پر سخت برہم تھا مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم نہ صرف اس برہمی میں پیش پیش تھے بلکہ انہی کی مساعی سے پاکستان کے عامۃ المسلمین خصوصاً مدارسِ دینیہ کے طلبہ میں مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ رشتے و تعلق کو بہت ناپسند قرار دیا جاتا تھا، خدا معلوم اسی رشتے و تعلق کی وجہ سے یا کسی دوسرے عارض کی بناء پر مولانا مرحوم نے مفتی صاحب کو دارالعلوم حقانیہ کی مدرّسی سے سبکدوش کیا تھا۔ مفتی صاحب نے مولانا کے اس فیصلے کے خلاف ایک کتاب لکھی۔ احقر نے خود تو اس کتاب کو دیکھا نہیں لیکن سُنا تھا کہ اس میں قضا علی الغائب کے عدم جواز کو مولانا مرحوم کے فیصلے کی غلطی کی بنیاد بنایا گیا تھا۔

اس قضیئے کا یہ تمام سلسلہ دارالعلوم حقانیہ میں میرا داخلہ لینے سے پہلے گذر چکا تھا۔ جو کچھ مقصودِ بیان ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے مفتی صاحب کی اسی کتاب کا رد لکھا تھا۔ مولانا مرحوم کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے دفتر دارالعلوم میں اس جوابی کتاب کے ذکر سے مولانا مرحوم کو متوجہ کیا اور پھر کسی قدر جذباتی انداز میں یہ یا اس کے قریب المفہوم کوئی جملہ کہا "اُن کا خیال ہے کہ پھر کوئی ان کے مقابلے میں سکوت ہی اختیار کرے گا!" وہ صاحب اس پر مزید تبصرہ کرنے کے موڈ میں دکھائی دے رہے تھے، لیکن مولانا مرحوم کی معنی خیز خاموشی اور آنکھوں سے برستی ہوئی ناگواری نے اُن کو باز رکھا۔ اگرچہ کسی کی ہیئت و ادا سے اُس کے منشاء و مقصود پر استدلال کرنا اچھی خاصی ذہانت اور تجربے کے بعد ہی ممکن ہے۔ جبکہ ذہانت کی قابلِ لحاظ مقدار کے لیے تو احقر آج بھی ترس رہا ہے اُس وقت کیا ہوتی اور مولانا مرحوم کے بارے میں اُس وقت تک تجربہ بھی حاصل نہ تھا لیکن مولانا مرحوم کی یہ ہیئت و ادا دلالت میں اس قدر واضح تھی کہ اس کا منشا سمجھنے میں کوئی ہچکچاہٹ پیش نہ آئی اور بعد کے تجربات نے تو اس پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے یہ تلمیذِ رشید اپنے استاذ کی طرح کسی کو بھی اپنے سے حقیر و کمتر سمجھنے اور قرار دینے کا روادار نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف تنقید سُننے کا تحمل تھا بلکہ بڑی آمادگی کے ساتھ اس کو ہضم کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ کیا حقیقی تواضع کے بغیر عملاً اس رویئے کو اپنانا آسان ہے؟

تواضع کا بے مثال واقعہ

دارالعلوم حقانیہ کے زمانۂ طالب علمی میں غیر حاضری یا کسی دوسری قانونی خلاف ورزی پر میرا کئی روز کا کھانا بند کر دیا گیا تھا۔ اُس وقت مدارس کے مہتممین اور ناظمین کے بارے میں میرا رویہ خاصہ جارحانہ ہوا کرتا تھا، کسی بھی جرم کی پاداش سے گلو خلاصی کے لیے عذر و معذرت کے بجائے مدرسے کے ذمہ داروں کی خلاف ورزیوں کا ڈھول پیٹنا میرا اسب سے بڑا کمال تھا۔ مولانا اللہ نور صاحب افغانی مدظلہ، میرے رفیقِ درس تھے۔ طالب علمی ہی سے بہت سلجھے ہوئے اور حوصلہ مند شخصیت کے مالک ہیں۔ عمر، عقل اور قابلیت ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے اور فائق تھے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ میں اپنے بارے میں اُن کی خصوصی خیر خواہی اور ہمدردی سے کافی متاثر تھا، غالباً انہوں نے مدرسے کی زیادتی اور اپنی بے گناہی کے موضوع پر میری یاوہ گوئی سُنی ہوگی، چنانچہ وہ مجھے اس نصیحت و تلقین کے ساتھ دفترِ اہتمام میں مولانا مرحوم کے پاس لے گئے کہ تم بالکل خاموش رہو گے میں ہی صُلح صفائی سے تمہارا کھانا واگذار کراؤں گا۔ پوری تفصیلات تو یاد نہیں لیکن شاید میری طرف سے مولانا اللہ نور صاحب کے اعتذار پر مولانا مرحوم نے ضعفِ عذر کی طرف اشارہ فرمایا تو گویا میرے غیض و غضب کے بارود خانے کو شتابہ دکھایا۔ چنانچہ چشم زدن میں بے ادبی کا وہ دھماکہ ہوا جس نے خاموشی کے وعدے، مولانا مرحوم جیسے فرشتہ خصلت عالم اور دارالعلوم جیسے مؤقر دینی ادارے کے احترام و تقدس جیسی قیمتی قدروں کو بھک سے اُڑا دیا۔ مولانا اللہ نور صاحب منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو جانے کا بار بار اشارہ فرماتے لیکن میں کسی سکتے اور وقفے کے بغیر اپنی جوابی تقریر بلکہ حملہ جاری رکھے ہوئے تھا اور مصلحت یا مروت کی جُملہ تہی و پرانی قانونی استثناءات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان میں سے ایک ایک کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دفتر والوں کی گردن زدنی کی وجہ وجوب بنا بنا کر پیش کر رہا تھا لیکن داد دیجئے اس منکسر المزاج، درویش منش اور داخلے واخراج اور سزا و معافی کے بارے میں کسی بھی بندے کے سامنے غیر مسئول اس مہتمم کے حیران کن ثبات و استقامت کی کہ اس پورے طوفان و طغیان کے دوران سوائے میرے منہ کو تکتے رہنے کے ان کے حال یا قال سے کوئی برہمی یا بیزاری ظاہر نہیں ہوئی بلکہ کھانے کی واگذاری کے ساتھ ہم دونوں کو رخصت فرمایا۔

پروردگار! تو ہی ستار و غفار ہے، ہم قول و فعل کی ایسی تمام بیہودگیوں پر سخت شرمندہ و شرمسار ہیں۔ مولائے کریم! ماضی کے ہر گناہ کی مغفرت فرما اور مستقبل کے ہر گناہ سے محفوظ فرما۔ آمین ثم آمین

اسراف سے اجتناب اور تنبیہ کا پیارا انداز

موسم گرما کی ایک دھند آلود سہ پہر تھی اور میں بالکل ہی اکیلا دار الحدیث میں بیٹھا کسی درسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، شاید جمعہ کا دن ہو گا جو دار الحدیث طلبہ سے خالی تھا ورنہ روزانہ اس وقت تو دار الحدیث میں مولانا مرحوم کا درسِ ترمذی ہوا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہلکے ہلکے بادلوں اور ٹھنڈی ہوا نے فضا میں اس قدر خنکی گھول دی تھی کہ حبس سے موسم کی ساری تپش جاتی رہی تھی، مگر میں اس پوری صورتحال سے بے تعلق مطالعہ کتاب میں مستغرق تھا اور دار الحدیث کا ایک پنکھا میرے عین اوپر محوِ گردش تھا کہ اچانک بڑے دروازے کی طرف سے کسی کے بہت تیزی کے ساتھ داخلے سے چونک پڑا تو دیکھا کہ مولانا محترم نہایت شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ریگولیٹر کی جانب بڑھ رہے ہیں، کسی زبانی کلامی طنز و تعریض کے بغیر پنکھا بند فرمایا اور واپس نکل گئے اور پھر میں بھی اس غفلت و کوتاہی پر ندامت کے شدید احساس کے ساتھ کتاب بند کر کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

اسلامی اخلاق کا بلند معیار

ضلع مردان اور اس کے آس پاس میں خصوصاً اور سرحد و بلوچستان بشمول شمال تا جنوب پھیلی ہوئی مغربی پٹی پر واقع قبائلی علاقہ جات اور ملحقہ افغانستان وغیرہ میں بعض علماء اور انکے حلقہ تراجم کی نسبت سے انکے مخصوص موقف کی بدولت خود ہی دیوبندی مکتبۂ فکر میں بہت گرما گرم اختلاف برپا تھا اور اب بھی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب فریقین نے تھک ہار کر اور ہر ایک نے فریقِ مخالف کے بالکلیہ استیصال سے مایوس ہو کر ایک دوسرے کو برداشت کر لیا ہے اور آئے روز کی وہ دھینگا مشتیاں باقی نہیں رہیں جو ہماری طالب علمی کے زمانہ میں ہوتی تھیں۔ جانبین کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ کرنا تو نہایت معتمد و مستند اور ارباب علم و فضل کا کام ہے لیکن اپنا خیال تو یہ ہے کہ نفسِ مسائل میں چنداں اختلاف نہیں۔ واقعات و جزئیات کی تفریع و تطبیق میں اگر دیانتدارانہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو ممکن ہے سرے سے اختلاف ہی باقی نہ رہے یا اس حد تک کم ہو جائے جس کو خوشدلی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ لیکن سارا کام بگاڑ کر رکھ دیا ہے حکمت اور موعظتِ حسنہ کے بجائے مناظرانہ بلکہ متحدیانہ اور مجادلانہ طرزِ گفتگو و تخاطب نے۔ فالی اللہ المشتکی

مولانا مرحوم ہمیشہ کے لیے اختلاف و افتراق کی ان معرکہ آرائیوں سے دُور اور لاتعلق رہے، تاہم بربنائے اخلاق و مروت لوگوں کی غمی و خوشی میں ضروری حد تک شرکت فرمایا کرتے تھے۔ مذکورہ تراجمی حلقے غمی و خوشی کی ان سب تقریبات میں روا رہنے والی غیر مسنون رسوم اور بدعات کو مولانا مرحوم کی رضامندی اور مسلک پر محمول کرتے بلکہ اُن کے بعض غیر محتاط منتسبین و متعلقین تو اعلانیہ ان کا نام لے کر نازیبا الفاظ استعمال کرتے ــــ احقر کو مولانا مرحوم کی بے شمار مجالسِ پند و وعظ اور تعلیم و تدریس میں شرکت کا موقع ملا لیکن مجال ہے کہ صراحتہً تو کیا اشاروں کنایوں میں بھی اپنے بارے میں کسی کی بدتمیزی کا نوٹس لیا ہو!۔ اسلامی اخلاق کی فضیلت و اہمیت پر لمبی لمبی تقریریں کرنے والے اور ان کی علمی باریکیوں پر دادِ تحسین دینے والے تو بہت ملیں گے لیکن واقعات کی دنیا میں برت کر دکھانے والے ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں ــــ ایسے موقعوں پر رہ رہ کر اپنے ایک مرحوم استاد کی بیان کردہ یہ حکایت یاد آتی ہے کہ کسی نے غالبًا ابو البرکات بغدادیؒ سے شیخ بو علی سیناؒ کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کیسے آدمی ہیں؟ آپ نے فرمایا "اخلاق ندارد"۔ کسی نے جا کر شیخؒ کو بتلا دیا شیخؒ نے اخلاق کے موضوع پر پوری کتاب لکھ کر ابو البرکات بغدادیؒ کے پاس بھیجدی۔ آپ نے کتاب دیکھ کر فرمایا کہ میں نے کب کہا تھا کہ "اخلاق نداند" میں نے تو یہ کہا تھا کہ "اخلاق ندارد"! ــــ معلوم نہیں کہ حکایت کس حد تک صحیح ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قول و فعل کے درمیان بڑے لمبے لمبے فاصلے ہیں اور مطلوب حال ہے قال نہیں۔

مولانا مرحوم کی دنیوی رفعت و عظمت کا تو ہر دیکھنے اور سننے والے کو اعتراف ہے، یہ پیش پا افتادہ حقیقت تو محتاجِ بیان نہیں اُنکی اُخروی قدر و منزلت بھی شب و روز کے مشاغل و معمولات، وظائف عبدیت کے اہتمام اور عامۃ المسلمین بالخصوص علماء و صالحین میں اس کی ہر دلعزیزی و قبولِ عام سے یہی کچھ مترشح ہوتا ہے کہ بارگاہ الٰہی کے مقبولین و مقربین میں سے تھے۔

اللّٰھمّ اغفر لنا ولہٗ وسائر المسلمین
وارزق اعلی الدرجات فی اعلیٰ علیّین
آمین ثم آمین

© rasailojaraid.com